تنقید و تبصرہ

محمد سرور

مدرسۂ دیوبند اور مطالبۂ پاکستان

(The Deoband School And the Demand for Pakistan)

یہ کتاب ضیاء الحسن فاروقی صاحب کا تحقیقی مقالہ (تھیسس) ہے جو موصوف نے کینیڈا کی میکگل یونیورسٹی میں ایم اے کے لئے پیش کیا، اور میکگل کے ڈائرکٹر مشہور عالم مشرقیات ڈاکٹر سمتھ کی رائے ہے چونکہ اس مقالے میں ہندوستان کی تاریخ کے اس دور کا بڑے عالمانہ طور پر احاطہ کیا گیا ہے، اس لئے اس کی اشاعت عمل میں آئی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اسلامی ہندوپاک کی تاریخ کے اس دور کو جس میں مدرسہ دیوبند اور علی گڑھ کا قیام عمل میں آیا۔ اور جس کے آخر میں مطالبہ پاکستان کی ہندوستان گیر تحریک چلی، مصنف نے واقعی عالمانہ طور سے پیش کیا ہے، اور باوجود اس کے کہ وہ کچھ عرصہ مدرسہ دیوبند کے ہم خیال علماء کی "جمعیت العلماء ہند" کے انگریزی آرگن سے متعلق رہے اور اب وہ ہندوستان کے ایک مشہور مسلم نیشنلسٹ تعلیمی ادارے میں کام کرتے ہیں، انہوں نے مدرسہ دیوبند اور مطالبۂ پاکستان کے حامیوں ہر دو کے نقطہ ہائے نظر بڑی تحقیق اور ساتھ ہی غیر معمولی علمی دیانت داری کے ساتھ پیش کئے ہیں، اور تبصرہ نگار کے نزدیک ہر فریق جو اس بحث میں اپنے حق میں اور فریق مخالف کے خلاف دلیل دے سکتا تھا۔ اور وہ دلیلیں دیتا رہا ہے، مصنف نے اس مختصر سی کتاب میں بڑی غیر جانب داری سے اجمالاً ان کو پیش کر دیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب اس قابل ہے کہ دونوں فریق اسے پڑھیں۔ اور اس آئینے میں اپنی اور دوسرے فریق کی صحیح تصویر دیکھیں۔

کتاب کی تمہید میں مصنف نے بجا طور سے اس پر تعجب کا اظہار کیا ہے کہ مدرسۂ دیو بند جو شروع سے مسلمانوں کی ایک راسخ العقیدہ مذہبی تحریک تھی، اور جو شریعت کے بقا و استحکام اور دینی روایات کو زندہ رکھنے پر زیادہ زور دیتی ہے۔ مطالبۂ پاکستان، جس کے پیش نظر برصغیر کے ایک حصے میں مذہب اسلام اور اسلامی روایات کے مطابق خود مسلمانوں کی ایک آزاد حکومت کا قیام تھا۔ مخالفت کرتا ہے۔ مصنف کے نزدیک ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ حصولِ پاکستان کی جدوجہد میں مدرسہ دیوبند پیش پیش ہوتا لیکن یہ کتنا بڑا معما ہے کہ دیوبندی نے بحیثیت مجموعی اس مطالبے کی شروع سے لے آخر تک مخالفت کی۔ مصنف نے اس کتاب میں اس معما کو حتی الوسع حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس ضمن میں ایک اچھی بات یہ ہے کہ فاروقی صاحب نے دونوں فریقوں کو اپنے اپنے مطالبے اور جدوجہد میں مخلص اور دیانت دار مان کر اپنی بحث کا آغاز کیا ہے چنانچہ کتاب کے دوران مطالعہ سے کہیں یہ تاثر نہیں ہوتا کہ وہ کسی فریق کی طرف ضرورت سے زیادہ جھکے ہوئے ہیں۔ مصنف کا یہ ذہنی موقف شروع سے آخر تک قائم رہتا ہے اور اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے۔

اورنگ زیب عالمگیر کی وفات (۱۷۰۷ء) کے بعد مغل سلطنت میں جو ابتری پھیلی، اس سے انگریزوں نے فائدہ اٹھایا، چنانچہ ۱۸۰۳ء میں وہ دہلی پر قابض ہو گئے۔ اور مغل بادشاہ ان کا وظیفہ خوار بن گیا۔ ۱۸۰۳ء ہی میں شاہ عبدالعزیز یہ فتویٰ دیتے ہیں کہ ہندوستان "دارالحرب" ہے جس کے شرعاً یہ معنیٰ ہوئے کہ اب عام مسلمانوں پر کفار کے خلاف جہاد فرض ہو گیا ہے۔ بقول مصنف، شاہ عبدالعزیزؒ نے اس وقت صرف اس فتوے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کی رہنمائی میں وہ جدوجہد شروع ہوئی جس کے اوّلین قائد سیّد احمد شہید اور خود شاہ صاحب کے بھتیجے شاہ شاہ اسمٰعیل شہید تھے۔ بالاکوٹ (۱۸۳۱ء) اور محاربۂ دہلی (۱۸۵۷ء) کی ناکامی کے بعد اسی تحریک کے حامیوں نے ۱۸۶۷ میں مدرسہ دیوبند کی بنیاد رکھی۔ اور اس کے کچھ عرصہ بعد ہی علی گڑھ میں سرسید نے کالج کی طرح ڈالی۔

یوں تو مدرسہ دیوبند کے بانی اور مفکر مولانا محمد قاسم اور علی گڑھ کالج کے بانی و مفکر سرسید

دونوں کے دونوں ولی اللہی تحریک سے متاثر تھے، اور دونوں ایک ایسے استاد کے شاگرد تھے جو سلسلۂ ولی اللہی کی ایک ممتاز شخصیت تھی، لیکن جس طرح ان دونوں بزرگوں کے نقطۂ نظر میں شروع ہی سے ایک بنیادی اختلاف تھا اسی طرح ان کی قائم کردہ یہ درس گاہیں ایک دوسرے سے مختلف راہوں پر چلیں۔ چنانچہ آخر میں ۱۹۳۷ء کے بعد جہاں مدرسۂ دیوبند مطالبہ پاکستان کے مخالفوں کا مرکز بنا، وہاں علی گڑھ نے اس تحریک میں پورے جوش وخروش سے حصہ لیا۔ مصنف کے خیال میں مطالبۂ پاکستان کی حمایت اور اس کی مخالفت دراصل مسلمانان ہند و پاک کے ان دو مختلف نقطہ ہائے کا عملی نتیجہ تھا، اور یہ شاید ایک حد تک ناگزیر تھا۔ بات یہ ہوئی کہ مدرسہ دیوبند کے اہل رائے واختیار کا تمام تر فکری پس منظر انگریز دشمنی پر مرکوز تھا۔ اور وہ ہر اس چیز سے جس سے انگریز اور انگریزیت کی بو آتی، متنفر تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ شریعت یعنی پرانے فقہی نظام کو برقرار رکھنے اور اسلاف کی روایات کے تتبع پر بہت زور دیتے تھے۔ اس کے برعکس سرسید نے انگریزوں کے آنے کی وجہ سے برصغیر میں جو نئے سیاسی ومعاشرتی حالات رونما ہو رہے تھے، ان کی حقیقت اور ان سے آگے چل کر پیدا ہونے والے نتائج کو سمجھا، اور ان سے عہدہ برآ ہونے کی راہ سجھائی۔ غرض عام الفاظ میں دیوبند کی تمام تر توجہ ماضی کے اسلامی فکر ونظام کو بحال رکھنے کی طرف رہی اور علی گڑھ کا سارا زور حال مستقبل کی ضرورتوں اور تقاضوں پر صرف ہوتا رہا۔ اس لئے دیوبند تو انگریز دشمنی پر اڑا رہا، اور علی گڑھ نے نئے حالات کے ساتھ مفاہمت کرنا ضروری سمجھا۔ مصنف نے اس ضمن میں بڑے افسوس کا اظہار کیا ہے کہ اس دوران میں ایک طرف قدامت پسندی وروایت پرستی اور دوسری طرف تجدید پسندی کے درمیان کوئی بیچ کی راہ نہ نکلی، اور دیوبند اور علی گڑھ فکری وسیاسی واجتماعی دونوں لحاظ سے دو متحارب گروہوں میں بٹے رہے۔ اور مزید بدقسمتی یہ ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے آزاد ہونے کے بعد بھی دونوں ملکوں کے مسلمانوں میں کم سے کم فکر ونظر کی یہ باہمی مخاصمت اب بھی موجود ہے۔ اور فی الحال فکری وعملی مصالحت کی کوئی راہ نہیں نکل رہی ہے۔

مطالبۂ پاکستان کی حمایت اور اس کی مخالفت میں "علی گڑھ" اور "دیوبند" کی طرف سے جو دلیلیں

پیش کی جاتی تھیں، مصنف نے مختصراً ان سب کو بیان کردیا ہے۔ کتاب کے آخری باب کا عنوان "نتائج" ہے، جس کا آغاز فاروقی صاحب یوں کرتے ہیں "ہم نے سابقہ ابواب میں دیکھا کہ روایاتِ اسلاف کے متبع علمار کا ردّعمل ہندوستان میں انگریزی نفوذ مع اس کے تمام سیاسی تمدنی اور مذہبی اثرات کے خلاف کیا تھا۔ اور ہم نے یہ بھی دیکھا کہ اسلام کی گزشتہ عظمت کو بحال کرنے کے لئے وہ کتنے فکرمند تھے۔ اور اس کے لئے انہوں نے کتنی جدوجہد کی۔ نیز وہ میراثِ اسلام جس کے یہ بزرگ اپنے قرونِ وسطےٰ سے وارث ہوئے تھے، اسے برقرار رکھنے کے لئے ہماری نظر سے ان کی کوششوں کا حال بھی گزر چکا ہے اس ضمن میں ان علمار کی فکرمندی بے شک مبنی برخلوص تھی، اور ان کی جدوجہد بھی حق بجانب تھی، لیکن بقول مصنف۔

"تاریخ کا فیصلہ ان کے خلاف ہوا"

اور مدرسۂ دیوبند کے اہل رائے و اختیار کی تمام کوششوں کے باوجود برصغیر تقسیم ہوا اور پاکستان کا قیام وجود میں آگیا۔

بہرحال یہ سب باتیں اُس تاریخی دور سے تعلق رکھتی ہیں، جو گزر گیا چنانچہ اب ضرورت اور مناسب یہ ہے کہ ان تمام باتوں کو وقتی جذباتیت سے بلند ہوکر تاریخی معروضیت (objectivity) کی نگاہ سے دیکھا جائے اور ان سے نکلنے والے نتائج سے "مدرسۂ دیوبند" سے متاثر مکتبِ خیال کے علمار اور "علی گڑھ کالج" کا ذہنی موقف رکھنے والے تجدید پسند دونوں استفادہ کریں۔ اور باہمی افہام و تفہیم سے اپنے مستقبل (فکری، معاشرتی اور سیاسی) کی تشکیل کریں۔ خوش قسمتی سے یہ باہمی افہام و تفہیم اب اتنی مشکل نہیں جتنی اگست ۱۹۴۷ء سے قبل تھی۔ ایک تو برصغیر سے انگریز چلا گیا۔ جس کا وجود خواہ مخواہ اس بحث میں آتا تھا۔ اور اس کی وجہ سے فریقین کا باہمی نزاع جذباتیت کا رنگ اختیار کرلیتا تھا۔ دوسرے پاکستان اور ہندوستان کی آزادی کے بعد آخرالذکر ملک میں فرقہ وارانہ کشمکش نے ایسی صورت اختیار کرلی ہے کہ نہ صرف پاکستان میں رہنے والے مکتبِ دیوبند سے متاثر اور منتسب حضرات

کے مملکت پاکستان کے بارے میں وہ جذبات و خیالات نہیں رہے، جو حصول پاکستان کی جدو جہد کے دوران تھے۔ بلکہ خود ہندوستان کے دیو بندی حضرات اب تحریک پاکستان اور اس کے نتیجے میں قائم شدہ مملکت پاکستان کو اس نظر سے نہیں دیکھتے، جس سے وہ ۱۹۴۷ء سے پہلے دیکھنے کے عادی ہو گئے تھے، اب ان کے سامنے پاکستان کا مسئلہ نہیں بلکہ ان کی تمام تر مساعی دستوری لحاظ سے "سیکولر" اور عملاً ہندو فرقہ پرست بھارت میں اپنے اسلامی وجود کو برقرار رکھنے پر مرکوز ہیں اور اس کے لئے انہیں زندگی و موت کی لڑائی لڑنی پڑ رہی ہے۔

"مدرسۂ دیوبند" جس سے آج مراد راسخ العقیدہ اسلاف پرست و قدامت پسند مکتب خیال" ہے اور اسی طرح "علی گڑھ" جو مرادف ہے اس "مکتب خیال" سے جس نے ذہناً انگریزی تعلیم کے اثرات کو قبول کیا اور عملاً تجدید پسندی کو اپنایا، ان دونوں کے ایک دوسرے سے قریب تر ہونے میں پاکستان اور ہندوستان کے مسلمانوں کے موجودہ سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی حالات کافی سازگار ہیں۔ نیز بین الاقوامی اور خاص طور سے بین الاسلامی[1] حالات بھی اس میں بہت حد تک ممد و معاون ہیں۔ ضرورت ہے کہ دونوں مکاتب خیال کے اہل الرائے حضرات ان داخلی و خارجی حالات سے فائدہ اٹھائیں اور اس آویزش اور مخاصمت کو ختم کریں، جو گزشتہ ایک صدی سے

---

[1] ایک زمانے میں افغانستان قدامت کا سب سے مضبوط گڑھ تھا، لیکن آج وہاں جس سرعت سے سماجی آزادی آ رہی ہے، وہ "علی گڑھ" کے تجدید پسندوں کو بھی حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ سعودی عرب میں بھی اسلاف پرستی کا بڑا زور ہے، لیکن تیل کی وجہ سے وہاں جو دولت کی فراوانی ہے، اس کے نتیجے میں وہاں کا معاشرہ یورپ کی اکثر نعمتوں سے محظوظ ہو رہا ہے۔ ایک زمانے میں قاہرہ کی جامعہ ازہر فکر و نظر کی قدامت پسندی میں مدرسہ دیوبند سے بھی آگے تھی لیکن صدر ناصر کی "سوشلسٹ" اصلاحات نے اسے اب بالکل ایک جدید درس گاہ بنا دیا ہے۔ جہاں علوم اسلامیہ کے ساتھ ساتھ جدید طریقوں پر جدید علوم پڑھائے جائیں گے۔

قدامت پسندی اور تجدید پسندی میں چل رہی ہے آج مسلمانوں کو فکری، سماجی، اقتصادی اور سیاسی، ان سب محاذوں پر بڑے سنگین چیلنجوں کا مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے۔ اور ان سے وہ صرف اسی طرح عہدہ برآ ہو سکتے ہیں کہ ان کی معنوی قوتیں مربوط و ہم آہنگ ہوں ـــ وہ اپنے ماضی حال اور مستقبل کو ایک فکری وحدت دے سکیں۔ اور ان کے فکر اور عمل میں کم سے کم تضاد ہو۔

مولانا عبیداللہ سندھیؒ فرمایا کرتے تھے کہ مدرسۂ دیوبند کے بانی مولانا محمد قاسمؒ اور علی گڑھ کالج کے مؤسس سر سید احمد خاںؒ دونوں فکر ولی اللہی سے متاثر اور منتسب تھے دونوں کا سلسلۂ تلمذ مولانا مملوک علی سے تھا، جو ایک واسطے سے شاہ عبدالعزیزؒ کے شاگرد ہیں۔ اب بقول مولانا سندھیؒ کے، فکر ولی اللہی مشتمل تھا دو اجزا پر، ایک جزو عقلیت تھا اور دوسرا جزو سلف صالح کا تتبع۔ ۱۸۵۷ء کی ناکامی اور مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کے خاتمے کے بعد جب مسلمانوں میں نئی زندگی کے آثار پیدا ہوئے، اور انہیں عملی شکل دینے کی کوششیں ہوئیں تو سر سیدؒ فکر ولی اللہی کے اس جزو کو جس میں عقلیت مرجح اور مقدم تھی، علی گڑھ لے گئے اور وہ جزو جس میں سلف صالح کے تتبع پر زیادہ زور تھا، مولانا محمد قاسمؒ نے مدرسۂ دیوبند کو اس کا محافظ مرکز بنایا۔ مولانا سندھیؒ فرمایا کرتے تھے کہ فکر ولی اللہی کی عقلیت یقیناً مولانا محمد قاسمؒ کے ہاں بھی تھی اور سر سیدؒ کو بھی حتمی طور پر اسلاف کی روایات سے دلی وابستگی تھی اور وہ ان کے احترام کرتے ہیں۔ ہاں اختلاف صرف ترجیح و تقدیم کا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود اس اختلاف کے دونوں بزرگ ایک دوسرے کے معترف تھے اور ایک دوسرے کی عزت کرتے تھے۔ چنانچہ مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے لئے سر سید نے مولوی عبداللہ صاحب کو مذہبی اتالیق مقرر کیا، جو بقول ان کے "ذاتی بیں مملوک علی صاحب کے داماد ہیں مولوی محمد قاسم صاحب کے اور ان سب بزرگوں سے مجھے ذاتی واقفیت تھی۔ امید ہے کہ ان بزرگوں کی صحبت کے فیض سے مولوی عبداللہ صاحب کی بھی ایسی ہی طبیعت ہے کہ دینی کاموں کو بہ لحاظ دین اور بہ لحاظ محبت اسلام انجام دیں۔"

جب مولانا محمد قاسمؒ کا انتقال ہوا تو سر سیدؒ نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۲۴ر اپریل ۱۸۸۰ء میں ان کی تعزیت ان الفاظ میں کی تھی۔ "افسوس ہے کہ جناب ممدوح حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نے ۱۵ر اپریل ۱۸۸۰ء کو ضیق النفس کی بیماری میں بمقام دیوبند انتقال فرمایا زمانہ بہتوں کو رو چکا ہے اور آئندہ بھی

بہتوں کو روئے گا لیکن ایسے شخص کے لئے رونا جس کے بعد اس کا کوئی جانشین نظر نہ آوے، نہایت رنج وغم اور افسوس کا باعث ہوتا ہے .... زمانۂ تحصیل علم میں جیسے کہ وہ ذہانت اور عالی دماغی اور فہم و فراست میں معروف و مشہور تھے، ویسے ہی نیکی اور خدا پرستی میں بھی زبان زد اہل فضل وکمال تھے۔ ان کو جناب مولوی مظفر حسین صاحب کاندھلوی کی صحبت نے اتباع سنت پر بہت زیادہ راغب کر دیا تھا۔ اور حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے فیض صحبت سے ان کے دل کو ایک نہایت عالی مرتبہ کا دل بنا دیا تھا۔ خود بھی پابند شریعت تھے اور دوسرے لوگوں کو بھی پابند سنت و شریعت کرنے میں زائد از حد کوشش کرتے تھے۔ بایں ہمہ عام مسلمانوں کی بھلائی کا ان کو خیال تھا .....

"مسائل خلافیہ میں بعض لوگ ان سے ناراض تھے۔ اور بعضوں سے وہ ناراض تھے۔ مگر جہاں تک ہماری سمجھ ہے ہم مولوی محمد قاسم مرحوم کے کسی فعل کو خواہ کسی سے ناراضی کا ہو، خواہ کسی سے خوشی کا ہو، کسی طرح ہوائے نفس یا ضد یا عداوت پر محمول نہیں کر سکتے۔ ان کے تمام کام اور افعال جس قدر تھے، بلاشبہ للّٰہیت اور ثواب آخرت کی نظر سے تھے اور جس بات کو وہ حق اور سچ سمجھتے تھے اس کی پیروی کرتے تھے ان کا کسی سے ناراض ہونا صرف خدا کے لئے تھا اور کسی سے خوش ہونا بھی صرف خدا کے واسطے تھا۔ کسی شخص کو مولوی محمد قاسم صاحب اپنے ذاتی تعلقات کے سبب اچھا یا برا نہیں جانتے تھے۔ مسئلہ حب اللہ اور بغض اللہ خاص ان کے برتاؤ میں تھا۔ ان کی تمام خصلتیں فرشتوں کی سی خصلتیں تھیں۔ ہم اپنے دل سے ان کے ساتھ محبت رکھتے تھے اور ایسا شخص جس نے ایسی نیکی سے اپنی زندگی بسر کی ہو، بلاشبہ نہایت محبت کے لائق ہے ....." (مقالات سرسید حصۂ ہفتم)

مولانا محمد قاسمؒ بھی باوجود سرسیدؒ کے مذہبی عقائد سے ناخوش ہونے کے موصوف مسلمانوں کی عام بھلائی کے لئے جو پُرعزم کوششیں کر رہے تھے، ان کے قدرداں تھے اور اس کی وجہ سے اپنے دل میں سرسیدؒ کے لئے دوستی اور محبت کے جذبات پاتے تھے۔ (بحوالہ مدرسۂ دیوبند اور مطالبہ پاکستان)

بدقسمتی سے بعد میں جس ماحول اور جن حالات میں ان دونوں اداروں کا ارتقا عمل میں آیا، انہوں نے ان کو ایک دوسرے سے دور کر دیا، گو دیوبند اور علی گڑھ کے درمیان ۱۹۲۰ء میں کچھ قرب ہوا، لیکن وہ محض

ہنگامی تھا، اس لئے زیادہ دیر پا ثابت نہ ہوا۔ زیر نظر کتاب میں (ص۳۸) مصنف نے ڈاکٹر سید عابد حسین کے ایک مضمون کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ سرسید مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں تین مدرسے قائم کرنا چاہتے تھے۔ ایک انگریزی مدرسہ، جس میں تمام جدید علوم انگریزی میں پڑھائے جائیں دوسرا اردو مدرسہ، جس میں یہی علوم اردو میں پڑھائے جائیں۔ اور تیسرا عربی اور فارسی کا مدرسہ، بدقسمتی سے سرسید کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا، اور اس کے جانشینوں نے اسے محض گریجویٹ پیدا کرنے والی "فیکٹری" بنادیا۔

اسی طرح مولانا محمد قاسمؒ انگریزی زبان اور جدید علوم کے اتنے مخالف نہ تھے جس قدر ان کے بعد والے ہوگئے تھے۔ سوانح قاسمی کے مصنف مولانا مناظر احسن گیلانی نے مولانا محمد قاسمؒ کی ایک تقریر کا ذکر کیا ہے، جو آپ نے ۱۲۹۰ھ میں دیوبند کے جشن دستار بندی میں کی تھی اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مصنف موصوف لکھتے ہیں کہ اس تقریر میں مولانا محمد قاسم نے دارالعلوم دیوبند کے نصاب میں جدید علوم و فنون اور السنہ کی کتابیں کیوں شریک نہیں کی گئیں اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ جہاں ایک طرف "آج کل تعلیم علوم جدیدہ تو بوجہ کثرت مدارس سرکاری اس ترقی پر ہے کہ علوم قدیمہ کو سلاطین زمانہ سابق میں بھی یہ ترقی نہ ہوئی ہوگی" وہاں دوسری طرف "علوم نقلیہ (یعنی خالص دینی و اسلامی علوم) کا یہ تنزل ہوا کہ ایسا تنزل بھی کسی کارخانہ میں نہ ہوا ہوگا" لیکن اس کے ساتھ ہی ارشاد ہوتا ہے۔

> اس کے بعد (یعنی دارالعلوم دیوبند کے تعلیمی نصاب سے فارغ ہونے کے بعد) اگر طلبہ مدرسہ ہذا، مدارس سرکاری میں علوم جدیدہ کو حاصل کریں، تو ان کے کمال میں بات زیادہ موید ثابت ہوگی۔[۱]

---

[۱] سوانح قاسمی کے مصنف مولانا گیلانی لکھتے ہیں :- سیدنا الامام الکبیر (مولانا محمد قاسمؒ) کا صحیح تعلیمی نصب العین نگاہوں سے اوجھل ہوچکا ہے ..... جب چاہا یہ گیا تھا کہ اسلامی و دینی علوم کی صلاحیت اور ان علوم سے کافی مناسبت پیدا کرا لینے کے بعد جدید علوم اور نئی علمی زبانوں سے استفادہ کا (باقی حاشیہ ص۵۷ پر

مولانا محمد قاسمؒ کو آخری بار حج کے لئے جاتے ہوئے جہاز کے کپتان سے ملاقات کے دوران اس امر کا بھی شدید احساس ہوگیا تھا کہ انہیں خود انگریزی زبان سیکھنی چاہیئے اور اگر ان کی عمر وفا کرتی تو وہ اس زبان کو ضرور سیکھتے[1]۔

غرض مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے قیام سے سرسیدؒ کا جو مقصد تھا، وہ شرمندۂ تکمیل نہ ہو سکا، اور یہ مدرسہ ایک مخصوص ڈگر پر چلتا رہا۔ اسی طرح مولانا محمد قاسمؒ مدرسۂ دیوبند کو جس نہج پر چلانا چاہتے تھے، اس کے لئے بعد کے حالات سازگار ثابت نہ ہوئے اور اس کی وجہ سے نہ صرف مسلمانان پاک وہند سیاسی لحاظ سے دو بڑے گروہوں میں بٹے رہے۔ بلکہ ان میں جدید و قدیم کے معاملے میں جس قسم کا فکری و نظری اتحاد ہونا چاہیئے تھا، وہ بروئے کار نہ آسکا ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک کے اس طویل دور میں ان کے لئے یہ نقصان عظیم تھا۔

جہاں تک ہندوستان موجودہ بھارت میں مسلمانوں کے مستقبل کا تعلق ہے، زیر نظر کتاب کے مصنف نے ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی اس رائے سے اختلاف کیا ہے کہ "ہندوستان میں آئندہ سو سال یا شاید اس سے بھی کم مدّت میں مسلمانوں کا وجود ناپید ہو جائیگا۔"[2]

اور پاکستان کے ذکر میں ضیاء الحسن فاروقی صاحب لکھتے ہیں:۔

"اگر پاکستان، آگے چل کر، اسلام کی ایک ایسی نئی تعبیر پیش کرنے میں کامیاب ہوتا ہے جو ایک طرف اسلام کی صدیوں پرانی تاریخی روایات کے تمام بہترین اور صحت مند ترین عناصر

(بقیہ حاشیہ) موقع مسلمان بچوں کے لئے فراہم کیا جائے تو پھر ایسا کیوں نہ ہوا؟ اور تقریباً ایک صدی کی طویل تاریخ میں کوئی ایک "نمونہ" بھی اس تعلیمی نصب العین کے مطابق دیوبند کا دارالعلوم پیش نہ کر سکا۔"

[1] کتاب "ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت" مصنفہ مولانا گیلانی

[2] ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی نے اپنے ایک مضمون "پاکستان کلچر کی بنیادیں" میں اس رائے کا اظہار کیا ہے۔

کی حامل ہو اور دوسری طرف وہ ان چیلنجوں کا جو آج کے زمانے کے ہیں عقلی لحاظ سے مناسب جوابات فراہم کرے۔ تو اس صورت میں اور صرف اسی صورت میں پاکستان کے قیام اور اس کے نتیجے میں مسلمانان ہند کو جن مصائب سے گزرنا پڑا، اس کا معقول جواز نکل سکتا ہے۔"

اسی ضمن میں مصنف کا یہ بھی کہنا ہے :-

"یقینی طور سے پاکستان کے صرف اس نہج پر ارتقا ہی میں بحیثیت ایک مسلم سلطنت کے، اس کی طاقت و شوکت کا انحصار ہے۔ اقبال کے خواب بھی اسی طرح عملی جامہ پہن سکتے ہیں اور نئے ہندوستان کے مسلمان شہریوں کے لئے بھی یہی چیز وجہ سکون ہو سکتی ہے پاکستان کے معرض وجود میں آنے کا جواز اس میں ہے کہ وہاں متوازن و ہم آہنگ جدید اسلام پھلے پھولے، جو ایک طرف اپنے شاندار ماضی کے لئے مخزن ہو اور دوسری طرف بیسویں صدی کے چیلنجوں کے مقابلے کی صلاحیت رکھتا ہو۔"

یہ کتاب ہندوستان میں چھپی ہے۔ پاکستان کے بک سیلروں کے ہاں مل سکتی ہے قیمت ۱۷/۵۰ روپے

المسوی من احادیث الموطا

تالیف ـــــــ الامام ولی اللہ الدہلوی (عربی)

شاہ ولی اللہ کی یہ مشہور کتاب آج سے ۳۲ سال پہلے مکہ مکرمہ میں مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کے زیر اہتمام چھپی تھی۔ اس میں جگہ جگہ مولانا مرحوم کے تشریحی حاشیے ہیں شروع میں حضرت مولف کے حالات زندگی اور الموطا کی فارسی شرح المصفی پر آپ نے جو مبسوط مقدمہ لکھا تھا اس کا عربی ترجمہ ہے شاہ صاحب نے المسوی میں الموطا امام مالک کو نئے سرے سے ترتیب دیا ہے امام مالک کے وہ اقوال جن میں وہ باقی مجتہدین سے منفرد تھے حذف کر دیئے گئے ہیں الموطا کے ابواب سے متعلق قرآن مجید کی آیات کا اضافہ کیا گیا ہے اور تقریباً ہر باب کے آخر میں شاہ صاحب نے اپنی طرف سے توضیحی کلمات بھی شامل کر دیئے ہیں۔

ولائتی کپڑے کی نفیس جلد قیمت ۲۰ روپے

ملنے کا پتہ :- شاہ ولی اللہ اکیڈمی صدر حیدرآباد مغربی پاکستان